جوش کا ادب میں مقام

گوتم بدھ کی طرح حضرت جوش ملیح آبادی بھی عیش وعشرت کے ماحول میں پیدا ہوئے اور شاہانہ آب وتاب، آرام وآسائش اور ناز ونعم میں ہوش سنبھالا لیکن ہوش سنبھالتے ہی دکھوں کی صلیب پر اس لیے ٹنگ گئے کہ وہ ساری آسائشیں جنہیں گوتم بدھ نے ازخود چھوڑا تھا ان سے بوجوہ چھٹتی چلی گئیں اور ساری دنیا میں دکھ ہی دکھ پھیلے نظر آئے۔

گوتم بدھ اور جوش ملیح آبادی نے اپنے اپنے طور پر ان دکھوں کا مداوا کرنے کی سعی کی اور حضرت جوش ملیح آبادی نے ادب میں وہ مقام پایا جس کا اندازہ کرنے کے لیے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کام کے لیے صدیاں درکار ہیں۔ جس طرح غالب کی شخصیت اور شاعری پر ایک صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی پوری شخصیت اور شاعری گرفت میں نہیں آئی اسی طرح یہ بھی کم ممکن ہے کہ ہم آج ہی ان کا ادب میں مقام متعین کر دیں اور پھر ایسی صورت حال اور ایسے زمانے میں جس کے لیے جوش صاحب نے کہا تھا کہ:

> ''ہم پہ ہمہ دانی کا بھوت اس قدر سوار ہے کہ اکثر وبیشتر افراد بغیر شرم محسوس کیے اس بیسویں صدی میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں کہ سیاسیات، دینیات، ادبیات، نفسیات، معاشیات طبیعات، مابعد طبیعات اور خدا جانے کتنے 'آت' سے لے کر شطرنج، چوسر، گنجفہ، علم ید، موسیقی، عروض، پتنگ بازی، رل، جفر، کشتی اور گھوڑیوں کی سواری تک میں انہیں ایسی دستگاہ حاصل ہے کہ ملک میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

مجھے آپ چاہیں تو ان چند اندھوں میں شمار کرلیں جو ہاتھی کو ٹٹول ٹٹول کر جہاں جس اندھے کے ہاتھ پڑ گیا ہاتھی کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا کیے اور پورا ہاتھی کسی اندھے کی سمجھ میں نہ آیا۔ میر صاحب نے کہا تھا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

تو ایسے پراگندہ طبع لوگ جن کے پیدا ہونے میں صدیاں لگتی ہیں ان کا مقام متعین کرنے اور ان کو کلی طور پر دریافت کرنے میں بھی اتنا ہی عرصہ درکار ہوتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں اردو ادب کی ایسی ہی جو دو ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیات ہمیں داغ مفارقت دے گئیں اور جن کے لیے صف ماتم ابھی بچھی ہوئی تھی کہ ایک تیسرا نام بھی سامنے آ گیا۔ جوش اور فراق کے بعد جناب احسان دانش کا نام نامی۔ ایں ماتم سخت است۔ اور ماتم صرف جواں مرگی ہی کا نہیں ہوتا عمر طبعی کو پہنچ کر بھی اگر ایسے نادر روزگار لوگ زمانے سے منہ موڑ لیں تو ایک زمانہ ان کے لیے ماتم کناں رہتا ہے اور یہ لوگ تو خود اپنے اپنے دم سے زمانے تھے۔ حاصل کونین اور شاعر کونین۔

یہ اردو ادب کے ایسے روشن مینار تھے جن کی ضیا پاشی گزشتہ کم و بیش نصف صدی تک آسمان ادب کو منور کرتی رہی اور نظم و نثر کی دنیا میں وہ مہتابیاں انہوں نے چھوڑیں جن کی چھوٹ آئندہ اردو ادب پر مسلسل اور متواتر پڑتی رہے گی۔

اپنے مرنے سے دس روز قبل جوش صاحب کے انتقال پر فراق صاحب نے فرمایا تھا کہ

اک چراغ اور بجھا اک ستون اور گرا

اور اس سے کچھ پہلے اپنے لیے کہا تھا کہ

اب تم سے رخصت ہوتا ہوں
آؤ سنبھالو ساز غزل

اور یہ بھی کہا تھا

کہ دیکھو ہو گئے سنجیدہ سب درد دیوار!

تو واقعی اب صرف پٹڑی چمک رہی ہے اور گاڑی گزر چکی ہے۔!

لیکن یہاں چونکہ ہم جوش صاحب کے فراق میں جمع ہوئے ہیں اس لیے فراق صاحب اور جناب احسان دانش کے قطع نظر کرتے ہی بنے گی جو کم ممکن ہے۔

جوش صاحب پر ان کی زندگی میں دو اعتراضات بہت عام تھے۔ ایک یہ کہ ان کے ہاں

الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ الفاظ کا ریلا بہتا ہے، الفاظ کا ایک دریا ہے، ایک طوفانی سمندر ہے وغیرہ وغیرہ۔
اور یہ اس شخص کے بارے میں کہا جاتا رہا جس کا کہنا تھا کہ ۔

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پہ نہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

اور اس اعتراض کا جواب خود جوش صاحب نے ٹی وی کے ایک انٹرویو میں جناب ضیاء جالندھری کو یہ دیا تھا کہ ''کیا یہ الفاظ بے معنی ہوتے ہیں؟''
دوسرا اور زیادہ سخت اعتراض ان کے منکر ہونے پر تھا۔ تو صاحب شکوہ اللہ سے کس کو نہ ہوا۔ خود جناب حفیظ جالندھری جو ان کے سب سے بڑے معترض ہیں فرماتے ہیں۔

واقف ہوں خوب شومئی دست دعا سے میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

یا

جس نے اس دور کے انسان کیے ہوں پیدا
وہی میرا بھی خدا ہو مجھے منظور نہیں

علامہ اقبال جن کے ایمان اور یقین پر کوئی کافر ہی ہوگا جو شبہ کرے گا کہہ گئے ہیں کہ ۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اور کافر ثابت کرنے کے لیے تو میر تقی میر کے یہی اشعار کافی ہیں کہ ۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو کہ ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یا

وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے، خدا ہوتے!

اور غالب کہ ۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یا ع......ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت وغیرہ۔

اور میرزا محمد رفیع سودا سے لے کے جناب احسان دانش تک جس پر نظر ڈالیے۔ سودا کہتے ہیں کہ ۔

سمجھاؤں اپنے کفر کے گر رمز شیخ کو
بے اختیار کہہ اٹھے اسلام کچھ نہیں

اور جناب احسان دانش کا شعر ہے کہ ۔

نہ بتکدوں میں چراغاں نہ میکدوں میں ہجوم
تمام شہر مسلماں ہے دیکھیے کیا ہو!

اور علیٰ ہذا القیاس کون شاعر ایسا رہ جائے گا اساتذہ سے لے کے مبتدیوں تک اور دور قدیم سے دور جدید تک جس نے شکوئے شکایت سے گریز یا پرہیز کیا ہو۔ اور پھر ایک مدرسہ فکر یہ بھی ہے کہ ۔

اہل ایماں کے علاوہ ہیں ایمان والے
شک بھی ایماں ہے اگر حد یقین تک پہنچے

تو جوش صاحب کو منکر دین وایمان، متشکک، باغی چاہے جو کچھ آپ ثابت کریں، لیکن وہی کافر یہ بھی کہتا ہے کہ ۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

وہی منکر سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ بھی کرتا ہے، نعت خوانی اور مرثیہ گوئی بھی۔

ہر چند کے علامہ اقبال نے فرمایا کہ ۔

مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

لیکن فکرِ جہاں کیسے نہ ہو۔ شاعری درحقیقت ہے ہی فکرِ جہاں کا نام۔ اور اس فکر جہاں

میں شاعر اصل میں گھلتا ہے۔ شاعر اپنے دور کی زندگی اور زمانے کو جیسا پاتا ہے اسے خوب سے خوب تر بنانے کے خواب دیکھتا اور دکھاتا ہے چاہے وہ خود ان خوابوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس بے عملی ہی کا نام شاعری ہے۔ اقبال ''کردار کے غازی'' نہ بن سکنے کی اس لیے شکایت کرتے رہے کہ وہ شاعر تھے۔

اب سے کوئی پچیس برس پہلے جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے لاہور کے اورینٹل کالج میں شاعر کے بے عمل ہونے پر ایک لیکچر میں کہا تھا کہ پہلی شاعری دنیا میں بے عملی ہی سے شروع ہوئی کیونکہ جب انسان نے درختوں سے اتر کر غاروں میں رہنا شروع کیا تو کچھ بے عمل لوگ ایسے بھی تھے کہ شکار میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ چونکہ شکار عمل ہے اور ''لہو گرم رکھنے کا بہانہ'' لیکن یہ بے عمل لوگ اس کی تلافی یوں کرتے کہ ان غاروں کو صاف ستھرا رکھنے اور اپنے باعمل ساتھیوں کی عدم موجودگی میں ان غاروں کو پھولوں سے سجاتے اور آراستہ کرتے۔ فراق صاحب کے نزدیک یہ دنیا کی پہلی شاعری تھی۔ یہ غاروں کی تزئین اور غاروں کی آرائش سے لے کر آج تک شاعر کا یہی کام رہا کہ وہ کیسے اس دنیا کو زیادہ پر آسائش بنائے۔ ہر چند کہ اب یہ کام آرکیٹکٹ، ڈیکوریٹر، انجینئر اور سائنسدان کرتے ہیں لیکن ان آرکیٹکٹوں، انجینئروں، ڈیکوریٹروں اور سائنس دانوں کو یہ خواب شاعر ہی دکھاتا ہے جو خود بظاہر بے عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل فراق صاحب نے کہا تھا کہ ایک غیر شاعرانہ فعل ہے اور مثالیں یہ دی تھیں کہ جیسے کھانا جب دسترخوان پر سجا ہوا ہو تو بہت مرغوب لگتا ہے لیکن کھانے یا پکانے کا عمل غیر شاعرانہ یعنی ''دلگر'' ہے۔ اور عمل میں ایک داخلی دلگیری ہوتی ہے اس لئے شاعر اس ''دلگیری'' سے دور رہتا ہے اور بے عمل سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی مثالوں سے ایک مثال جناب وصل کی بھی فراق صاحب نے دی تھی اور کہا تھا کہ وصل عمل ہے اور عمل دلگر ہوتا ہے اور غیر شاعرانہ۔ اسی لیے وصل بلگرامی[1] نے انتہائی سخن فہمی اور بے حد عمدہ شعری انتخاب کے باوجود شعر نہ کہہ سکے کیونکہ تخلص تھا وصل۔ اور فراق چونکہ بے عملی ہے، اس لیے شاعری! اور شاعر۔

جوش صاحب پر ایک اعتراض یہ بھی رہا کہ وہ کرتے کراتے کچھ نہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ ساری دنیا کے خزانے ان پر کھول دیئے جائیں اور سارے جہان کی نعمتیں ان پر نچھاور کر دی جائیں اور ناقدری کا رونا روتے ہیں۔ تو ایک طرح سے ان پر یہ اعتراض کرنے والے بھی غلط نہیں ہیں اور جوش صاحب بھی اپنی جگہ صحیح تھے کہ وہ محض شاعر تھے جو انسان اور انسانیت کی بھلائی کے صرف خواب

دیکھ سکتے تھے اور بس!

جوش کی شاعری سے قطع نظر ان کی عام زندگی سے اس انسان دوستی کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً دلی میں ایک صاحب تھے محمود مورخ ایم۔اے جنہیں شاہد دہلوی صاحب مورخ کی بجائے ''مورخ'' بروزن یورش یا زورخ کہتے تھے کیونکہ محمود صاحب جو تاریخ کے ایم۔اے تھے اور شاید اسی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ مورخ لکھتے تھے۔ اس لفظ مورخ پر اعراب نہیں لگاتے تھے.....تو یہ بے چارے بہت ہی مفلوک الحال تھے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ''مسلمان'' اس اخبار کا نام تھا اور یہ اخبار انہوں نے صرف اشتہارات چھاپنے کی غرض سے نکالا تھا لیکن اشتہار جن کے، بہ از خود بغیر کہے اپنے اخبار میں چھاپتے ان میں سے کوئی ان غریب کو چائے کی پیالی پر ٹرخا تا کوئی بائیسکوپ کے ٹکٹ پر۔ کاغذ اپنے اخبار کے لیے یہ ساقی کے دفتر سے اٹھا کر لے جاتے اور اس کی چھپائی وغیرہ کا انتظام بھی شاہد صاحب ہی کے ذمے تھا۔ اس اخبار کے علاوہ ناول بھی لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ اپنے سارے ناول لے کر دلی کے کورونیشن ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں جوش صاحب دلی سے اپنا رسالہ کلیم نکالنے سے پہلے ٹھہرا کرتے تھے۔ جوش صاحب کے کمرے میں اس وقت محفل گرم تھی اور مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، فراق جیسے ان کے احباب خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ محمود مورخ صاحب نے جاتے ہی اپنے ناولوں کا ڈھیر جوش صاحب کے پلنگ پر پٹک دیا اور کہا کہ یہ بھی پڑھیے، بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں، اور ابھی خریدیئے یہ ناول۔ ہمیں بھی آپ کی طرح پیسے کی ضرورت ہے۔ نکالو جو کچھ جیب میں ہے اور ہمیں چائے بھی پلواؤ...... جوش صاحب نے کہا بجا ارشاد ہوا۔ ہوٹل والے کو چائے کا آرڈر دیا اور مجاز صاحب سے راز داری سے پوچھا ہمارے پاس کیا ہے۔ مجاز نے کہا دلی سے سری نگر تک کا کرایہ......اور کل ہمیں جانا ہے کشمیر۔ جوش صاحب نے کہا کل کی کل دیکھی جائے گی، آج ان کو یہ سب پیسے دے دو، کل کرائے کی رقم۔

ساقی کے مدیر اور مئے ناب سے دور
برحد نہند نام زنگی کافور

سے قرض لی جائے گی ......اور پھر...... یارانِ طریقت سے کہا کہ بس اب تخلیہ۔ اور وجہ یہ بتائی کہ اب ہم محمود مورخ صاحب کے یہ سارے ناول رات بھر پڑھیں گے۔ کیونکہ اگر صبح آ کر ان صاحب نے اپنی ان تخلیقات پر رائے طلب کی تو کہیں ہم کورے نہ نکلیں اور ان کی دل آزاری کا باعث

نہ ہوں۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزار ہا کعبہ یک دل بہتر است

ایک اور واقعہ یوں ہوا کہ رات کی چوٹی کر تک آنے سے پہلے یعنی گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان فراق صاحب کہیں سے ہنڈتے ہنڈاتے اپنے چند دوستوں کے ساتھ اسی دلی کے کورونیشن ہوٹل میں جوش صاحب کے کمرے میں آدھمکے اور کہا کہ "اچھا، رت جگا جاری ہے"۔ جوش صاحب نے مجاز کی طرف دیکھا اور کہا کہ ع....اے پیر مغاں اور۔ابھی اور.....ابھی اور.....مجاز نے کہا پیر مغاں تو نوح ناروی ہیں جن کا یہ مصرع ہے اور ہوٹل والے قرض کی مے نہیں دیتے صرف سوڈا قرض مل سکتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا تو پھر سوڈے کی بوتلیں منگوایئے اور بیرے سے کہیے نیچے خالی بوتلوں والوں کی دکان پر بیچ کر آئے اور ان بوتلوں کی ٹھکری ہوئی چاندی سے " پگھلا ہوا سونا" ہوٹل والوں سے خریدے۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اور یہ نسخہ ہم نے "ریاست" کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں سے سیکھا ہے جو بقول خواجہ حسن نظامی فتنہ زدہ آدمی ہے۔

فراق صاحب کے ساتھ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزل اور نظم پر کوئی بحث چل نکلی اور جوش صاحب نے مولانا کوثر نیازی کے مجموعے سے پہلے غزل کی کبھی تعریف نہیں کی تھی چنانچہ بات ایسی بڑھی اور فراق صاحب اور جوش صاحب میں اتنی تلخ کلامی ہوئی کہ دونوں نے مرتے دم تک ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھنے کی قسمیں کھالیں۔ بھری محفل میں۔اور جب فراق صاحب جوش صاحب سے کٹی کر کے جانے لگے تو انہیں وہ کام یاد آیا جس کے لیے ایک صاحب کو لے کر وہ جوش صاحب کے پاس آئے تھے کہا کہ اصل میں ان صاحب کے لیے ہمیں آپ سے ایک سفارشی خط لینا تھا بی سروجنی کے لیے۔اور یہ کہہ کر فراق نے مجاز کی طرف دیکھا جو ایک دفعہ ان کے ساتھ بی سروجنی کہہ کہہ کر مسز سروجنی نائیڈو کو مخاطب کرتے رہے تھے اور بعد میں یہ یاروں کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا کہ ذرا کسی کی طرف سے بے رخی دیکھی اور کہا کہ "بی سروجنی پھر ہمیں کیوں بلایا تھا"۔ تو اس بی سروجنی کی ترکیب پر جوش صاحب چونکے اور فوراً مطلوبہ خط ان صاحب کے لیے لکھ کر فراق صاحب کو دیا اور کہا کہ آئندہ بھی کوئی کام ہو تو ہمارے پاس آیئے گا اور دونوں دھاڑیں مار مار کر روئے اور بغل گیر ہو

گئے۔

اس طرح کے واقعات اگر یکجا کیے جائیں جس میں جوش صاحب کی عالی ظرفی ہی عالی ظرفی ہو تو بات طرف داری کی سمجھی جائے گی اور پھر ضد میں ان کی خامیاں بھی گنوائی جا سکیں گی اور خامیاں کس میں نہیں ہوتیں۔

ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

اور سب جسے مانیں۔ بقول پنڈت رتن سرشار۔

بلبل یہ زمانہ ایک گل کا نہ ہوا
محکوم ائمہ و رسل کا نہ ہوا
بندے کو عبث غرور یکتائی ہے
اللہ پہ اتفاق کل کا نہ ہوا

اور پھر جوش صاحب کو خود تو غرور یا دعوۂ یکتائی تھا بھی نہیں۔ اپنی عظمت کا احساس انہیں ضرور تھا اور رہنا بھی چاہیے تھا۔ ان کے مخالفین بھی ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے لیے اختلاف کی صورتیں انہوں نے خود پیدا کیں۔ اپنی ناعاقبت اندیشی اور نامصلحت کوشی کی بنا پر مصلحت آشنا وہ اتنے بھی نہیں تھے کہ جس کے مصاحب بین کم سے کم اس کے ساتھ دنیا داری برتیں۔ جوش صاحب جب ''شہ کے مصاحب بنے'' تو غالب جتنی بھی دنیا داری نہ برتی اور نظام دکن کی ایک دعوت میں وہ گل کھلائے کہ ریاست حیدر آباد دکن سے خارج البلد کیے گئے۔ ہوا یہ کہ سر اکبر حیدری جو اس زمانے میں مذکورہ ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے، انہوں نے دعوت سے پہلے جوش صاحب کو سمجھایا کہ دیکھئے ڈنر میں شراب بھی پیش کی جائے گی لیکن جب تک اعلیٰ حضرت تشریف فرما ہیں آپ شراب کو ہاتھ نہ لگائیں اور انکار کر دیں۔ حضور کے جانے کے بعد آپ جتنی جی چاہے پئیں۔ لیکن بینکوئیٹ ہال میں جب نظام دکن تشریف فرما ہوئے اور انہوں نے پہلے جائے نماز منگوا کر عشاء کی نماز پڑھی تو پھر جب ڈنر شروع ہوا اور شراب ''سرو'' کی گئی تو جوش صاحب نے جام اٹھالیا اور سر اکبر حیدری کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جناب والا آپ چیں بہ چیں نہ ہوں۔ آپ نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ بنکوئیٹ ہال میں پہلے نماز پڑھی جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ان گنوں سے وہ کیسے پیشی میں رہ سکتے تھے اور ''شہ کے مصاحب!''

اصل میں مصیبت یہ تھی کہ جوش صاحب جس کے مصاحب بنتے اس سے خود مصاحبت کی توقع رکھتے۔ کراچی تشریف لائے تو اسکندر مرزا، اس زمانے کے صدر سے کہا کہ۔

آتے ہی جو میں تجھ پہ نہیں چھایا ہوں
میں جوش کو ہمراہ نہیں لایا ہوں
اے خسرو جم جاہ تری محفل میں
شبیر حسن خاں کی طرح آیا ہوں!

یعنی شبیر حسن خاں کی بھی طرح۔ اور پھر یہ بھی جانتے تھے کہ زمانہ کیا ہے ورنہ یہ نہ کہتے کہ۔

اے نازکی طبع کی روکے ہوئے باگ
شبیر حسن خاں زمانہ ہے کچھ اور

مگر نازکی طبع کی روکے ہوئے باگ شبیر حسن خاں تھے۔ جوش نہیں۔ جوش صاحب نے ادب میں اپنا مقام اپنے طور پر خود ہی ایک صحبت میں متعین کرالیا تھا۔ یاروں کی ایک محفل تھی جس میں اس دور کے سب ہی نامی گرامی شعراء جمع تھے اور سب کے بعد آخر میں خود اپنا کلام سنا رہے تھے تو سب شاعران کرام کے ساتھ مولانا سہا بھوپالی بھی اپنے مخصوص انداز میں جوش صاحب کی ہر نظم کے ہر بند کے آخر میں یوں داد دے رہے تھے کہ دور قدیم سے دور جدید تک کے ہر چھوٹے بڑے شاعر کو جوش کے مقابلے میں ایک طرف بٹھاتے جا رہے تھے۔ نظم کے ہر بند کے بعد فرماتے کہ اس شعر یا بند میں آپ نے فلاں فلاں کو بھی ایک طرف بٹھا دیا۔ ''ایک طرف بٹھانے'' کی ترکیب میں نے اخلاقاً لکھ دی ہے ورنہ مولانا سہا جو گالی دینے میں بھی طاق تھے سب کو سب کے سامنے بے نقط سنا رہے تھے۔ یہ زمانہ تھا ۱۹۴۰ء کے آس پاس کا اور مقام تھا وہی دلی کا کورونیشن ہوٹل۔ اور اپنے مقابلے میں جوش صاحب ہر بڑے سے بڑے شاعر کا قلع قمع ہوتے دیکھ کر ان مولانا سہا کے ہاتھوں خوش ہوتے رہے، جو گالیاں بکنے میں اتنے ماہر تھے کہ ایک مرتبہ شرط لگا کر بھرے دربار میں نواب صاحب رام پور کو گالی دے چکے تھے، جن کے یہ وظیفہ خوار تھے۔ اس طرح کہ دربار میں ایسی حرکتیں شروع کر دیں جو نواب صاحب کو ناگوار گزریں جس پر نواب صاحب نے بزعم خود مولانا سہا کی کچھ سرزنش کی۔ سہا صاحب نے کہا کہ آپ ہمارے ناصح مشفق بھی بن رہے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ یوں ہی سمجھ لیجئے تو مولانا سہا نے کہا ناصح مشفق کو تو شعر و سخن کی دنیا میں سب ہی ملاحیاں سناتے ہیں اور وہ وہ

صلواتیں ''ناصح مشفق'' کو سنائیں کہ نواب صاحب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔! اور یہ جملہ معترضہ اس لیے عرض کرنا پڑا کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ مولانا ہر شاعر کو جوش صاحب کے مقابلے میں ''ایک طرف بٹھانے'' کی جگہ کیا کیا ترکیبیں استعمال فرما رہے ہوں گے یا کس کس ترکیب سے ایک طرف بٹھا رہے ہوں گے۔

اور جوش ہر بند یا شعر کے بعد جب مولانا سہا سے فرماتے کہ...اور اقبال۔! تو مولانا سہا کہتے جاتے، اقبال کو ابھی رہنے دیجئے۔ آخر کار ایک نظم کے بند پر یہ بند بھی ٹوٹا۔ اور مولانا سہا نے علامہ اقبال کو بھی گویا ایک طرف بٹھا دیا۔ اور جوش صاحب نے اطمینان کا سانس لیا......لیکن کلام سنانے کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ایک بند پر سہا صاحب بولے کہ اب آپ نے مولانا سہا بھوپالی کو بھی ایک طرف بٹھا دیا......! جوش مارے غصے کے سرخ ہو گئے اور فرمایا کہ اچھا آپ اقبال کے بعد بھی بیٹھے تھے۔ آپ کو معلوم ہے آپ اقبال کے مقابلے میں بالشتیے ہیں۔ ذرا آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھئے اور قد بھی......!

اور اب آخر میں ایک چھوٹا سا قصہ جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میری نظر میں جوش کا ادب میں کیا مقام ہے۔ ہم اپنے بچپن میں اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے دلی کے لال قلعے کی بہت سی کہانیاں سنا کرتے تھے جن میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر نے جب ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی اور لال قلعے سے رخصت ہو گئے تو کچھ جاں نثار قلعے کی نگہداشت کے لیے ایسے رہ گئے جن کی نیت آخر وقت تک قلعے کی حفاظت کرنے کی تھی۔ ان میں ایک کالے خان نام کے گول انداز بھی تھے کہ جب گوروں نے دلی کے لال قلعے پر گولہ باری شروع کی تو انہوں نے اپنی ہنر مندی اور نشانے کی مہارت کے باعث جب تک بارود اور ہوش مندی ان کا ساتھ دیتی رہی قلعے کی دیوار پر کوئی گولہ یوں نہ لگنے دیا کہ جب دشمن کا گولہ آتا تو یہ تاک کر اس گولے کی سیدھ میں ایسا گولہ داغتے کہ گولے سے گولہ ٹکرا جاتا اور راستے ہی میں دشمن کا گولہ ضائع ہو جاتا۔ لیکن جب بارود ختم ہو گئی تو انہوں نے باجرے کے آٹے کے گولے بنوائے اور چلائے جس سے یہ ہوا کہ گولے راستے میں تو نہ پھٹے لیکن دیوار پر آ کر اس طرح لگے کہ قلعے کی دیواروں کو اس طرح کا نقصان نہ پہنچ سکا جس کا دشمن خواہاں تھا۔ اور آخر کار باجرے کے آٹے نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور کالے خان گول انداز نے جمنا میں چھلانگ لگا دی۔ تیراک بھی ایسے تھے کہ دریا میں دلی سے جو غوطہ لگایا تو آگرے جا کر نکلے......اور پھر وہاں سے

ایسے تلپٹ ہوئے کہ پتا ہی نہ چلا کر زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ انگریزوں نے برسوں ان کی تلاش جاری رکھی لیکن کہیں ان کا سراغ نہ پایا۔

دلی کے ان کالے خان گول انداز کی طرح جوش صاحب بھی اپنی شاعری اور شخصیت کے حفاظت اسی طرح کی کہ گول اندازی سے کرتے رہے اور اس سے پہلے کہ ان کے پاس بارود ختم ہو یا باجرے کے آٹے کے گولے چلانے کی نوبت آئے وہ پہلے غوطے میں چلے گئے اور پھر غوطہ لگا گئے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کا قلعہ اتنا مضبوط ہے کہ ان کے بعد بھی کوئی اسے مسمار نہیں کر سکتا......اور چھوٹے موٹے سنگریزوں کے بس کا یہ کام ہے نہیں۔

علامہ اقبال نے ایسے ہی جانباز لوگوں کے لیے فرمایا تھا کہ۔

چناں بہ زی کہ اگر مرگِ تست مرگِ دوام
خدا ز کردہ خود شرمسار تر گردد

۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء کو آرٹس کونسل کراچی میں پڑھا گیا۔

حاشیہ:

[۱]۔ جناب وصل بلگرامی ہر مشاعرے میں مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے اپنی جائے قیام پر سب شاعروں کو مدعو فرماتے اور ان سب کو مصرع طرح یا کوئی اپنی پسند کا مصرع دے کر فی البدیہہ پانچ پانچ چھ چھ اشعار کی غزلیں کہلواتے اور ہر غزل میں سے اپنی پسند کے اشعار منتخب کر کے اپنی غزل ترتیب دیتے۔ اس لیے مشاعرہ عموماً ان کے ہاتھ رہتا۔ اور کمال یہ تھا کہ ہر شاعر اس پر فخر کرتا کہ اس کی غزل میں سے کتنے شعر وصل صاحب نے منتخب کیے۔